© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

آپ اس لیے ڈوبنے والے کی مدد کریں گے کہ ایسا کرنا اپنی ذات میں اچھا ہے جبکہ اشاعرہ کی رائے میں ایسے مقام پر ڈوبنے والے کی اس لیے مدد کرنا ضروری ہے کہ اگر ہم خود کو اس کی جگہ پر رکھیں اور یہ سوچیں کہ اگر کوئی مجھے نجات دلا دے تو کتنا اچھا ہوگا لہٰذا اس اعتبار سے ڈوبنے والے کی مدد کرنا ضروری ہے۔

شیعہ مکتب

معتزلہ اور اشاعرہ کے علاوہ شیعہ علم کلام کی اپنی ایک تاریخ اور انفرادی حیثیت ہے۔ شیعہ علم کلام ایک طرف تو شیعہ احادیث کے بطن میں پروان چڑھتا ہے، دوسری طرف اس پر فلسفیانہ رنگ بہت زیادہ غالب ہے اور خاص طور پر خواجہ نصیر الدین طوسی کی تجرید الاعتقاد کے بعد شیعہ علم کلام مکمل طور پر فلسفیانہ بنیادوں پر استوار ہو چکا ہے۔ بظاہر اس کی ایک وجہ شیعہ احادیث میں موجود گہری منطقی و فلسفیانہ بحثیں ہیں جن میں اجتماعی اور ماورائے طبیعی مسائل کا عقلی و فلسفی بنیادوں پر تجزیہ کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں شیعہ علم کلام کی بنیاد حضرت علیؑ کے دور میں ہی پڑ چکی تھی۔ متنوع کلامی موضوعات پر نہج البلاغہ میں موجود آپ کے علمی وفکری خطبات اور گہری فلسفیانہ مباحث کو دیکھ کر اس حقیقت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ شیعہ علم کلام کی بنیاد حضرت علیؑ کے دور میں رکھی جا چکی تھی۔ اگرچہ شیعہ علم کلام میں عقلی و فلسفیانہ روش، برہانی ہونے کی وجہ سے معتزلہ کی جدلی روش سے بہت مختلف ہے لیکن مجموعی طور پر معتزلی مکتب کو کسی نہ کسی صورت میں زندہ رکھنے میں شیعہ علم کلام کا کردار بہت اہم ہے۔ علاوہ ازیں شیعہ متکلمین اور حکماء نے وحی الٰہی اور دینی پیشواؤں کے رہنما اصولوں کی روشنی میں مضبوط بنیادوں پر اسلامی عقائد کی تدوین میں اہم کردار ادا کیا اور کبھی بھی خود کو قرآن اور اہل بیت سے دور نہیں ہونے دیا۔

عام مسلمانوں کا مکتب بن گیا اور دوسری صدی ہجری کے اواخر کے بعد سے اب تک اشعری مذہب، مکتب اور کلام کا ہی غلبہ رہا ہے۔

روایتی علم کلام اور کلام جدید

الف- روایتی علم کلام میں ایک متکلم تین ذمہ داریاں انجام دیتا ہے۔ ایک عقائد دینی کی وضاحت، دوسری دینی عقائد کا اثبات اور تیسری اعتراضات وشبہات کا جواب۔ آج بھی ایک متکلم انہی تینوں ذمہ داریوں کو محسوس کرتا ہے۔ البتہ دینی عقائد کے دفاع کا جو جذبہ قدیم متکلمین میں تھا اس کی حیثیت اب کمزور پڑ چکی ہے۔ آج کے متکلم کے لیے اب ضروری ہو گیا ہے کہ وہ اپنا دفاع کرنے کی بجائے دوسرے کی بات کو بھی غور سے سنے اور پہلے سے اپنے ذہن میں اپنے عقائد کی قطعی حیثیت کا تعین نہ کرلے۔ علاوہ ازیں آج کے متکلم کے لیے اب یہ بھی ضروری ہو گیا ہے کہ وہ عقائد دینی کی وضاحت کرتے ہوئے انہیں پرکشش انداز میں پیش کرے اور دوسروں کے سامنے اپنے عقائد کی عملی افادیت اور ان کے دنیوی ثمرات کو ثابت کرے۔ گزشتہ دور کا متکلم، ایک متکلم ہونے کے ساتھ ساتھ مبلغ بھی ہوتا تھا جس کی وجہ سے اپنے عقائد کا اثبات اس کے لیے ہر حال میں ضروری ہوتا تھا لیکن آج کی دنیا میں ایک متکلم کے لیے ضروری ہو گیا ہے کہ وہ خود کو مبلغ کی بجائے دانشور اور اسکالر کے طور پر پیش کرے۔

ب- جس طرح روایتی علم کلام میں ایک متکلم، وحی الٰہی اور مخاطبین وحی کے درمیان رابطے کا کردار ادا کرتا ہے اور وہ وحی الٰہی کو لوگوں کے لیے قابل فہم بناتا ہے اسی طرح جدید علم کلام میں بھی ایک متکلم کا یہی کردار متعین ہے۔ تاہم اس بات کو مدنظر رکھنے کی ضرورت ہے کہ متکلم جس جہت سے وحی الٰہی سے وابستہ ہوتا ہے وہ ناقابل تبدیل اور غیر متغیر ہے جبکہ مخاطبین وحی کے ذہن مسلسل تبدیل ہو رہے ہیں ان میں عقلی وجذباتی لحاظ سے ارتقاء پیدا ہو رہا ہے لہٰذا ایک متکلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ وحی کی تشریح کرتے وقت مخاطبین میں آنے والی ذہنی تبدیلی کا خیال رکھے۔ یورپ کے صنعتی انقلاب کے بعد جس طرح ذہن انسانی کی حدود کو چیلنج کیا گیا اور جس طرح سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جدیدیت اپنے آثار ولوازم کے ساتھ سامنے آئی، جس کے نتیجے میں عقلیت پسندی اور تجربیت پسندی کی نئی نئی صورتیں سامنے آئیں، مطلقہ حقیقت کی بجائے حقیقت کے اضافی ونسبی ہونے کا نظریہ سامنے آیا، شخصیات اورادیان ومذاہب کی مقدس حیثیت کو چیلنج کر دیا گیا، ہر چیز کو دنیوی سعادت وشقاوت کے تناظر میں دیکھا جانے لگا، اطلاعات کے شعبے میں آنے والے انقلاب نے دنیا کو عالمی بستی میں تبدیلی کر دیا جس کی وجہ سے جہاں دوسروں کے نقطہ نظر تک رسائی آسان ہوگئی وہاں دوسرے افکار سے متاثر ہونے کی راہ بھی ہموار ہوگئی۔ اس کے علاوہ ان تمام چیزوں نے آج کے مخاطب کے ذہن، اس کی زبان اور زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ آج کے متکلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے مخاطب کے ذہن کو، اس کی زبان کو اور اس کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ انسانی علوم کے شعبے میں ہونے والی ترقی کے نتیجے میں سامنے آنے والے مسائل کو بھی مدنظر رکھے۔

روایتی علم کلام اور جدید علم کلام میں بنیادی فرق

دینی تعلیمات کو دو پہلوؤں سے دیکھا جا سکتا ہے:

الف: احکام اور قضیوں کی صورت میں (اس بات سے قطع نظر کہ ان پر کوئی ایمان لاتا ہے یا نہیں)۔اس پہلو کی بھی دو قسمیں ہیں:

۱- حق و باطل کو متعین کرنا جس کے لیے اس مسئلے یا حکم کی منطقی بنیادوں کو دیکھا جاتا ہے۔مثلاً اثبات خدا کے سلسلے میں دلائل

۲- احکام کی حقانیت کے اثبات کے بعد ان کے منطقی، کلامی، فلسفیانہ، اجتماعی، نفسیاتی اور ثقافتی لوازم اور نتائج کو دیکھنا۔جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوتا ہے: لَوْ كَانَ فِيهِمَا اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا اگر کائنات میں دو خدا ہوتے تو فساد برپا ہو جاتا۔

ب: لوگوں کی طرف سے ان احکام کو باور کرنا، ان پر ایمان لانا، قلبی اعتقاد پیدا کرنا۔ (احکام اسلامی کا ایمان لانے کے اعتبار سے مطالعہ کرنا، اس بات سے قطع نظر کہ یہ حق ہے یا باطل، صحیح ہے یا غلط)۔اس کا بھی تین طرح سے جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ ایک تاریخی دوسرا نفسیاتی اور تیسرا سماجیاتی حوالے سے۔ نفسیاتی اعتبار سے، دین کی طرف رغبت کے نفسیاتی فوائد اور نتائج۔ پھر اجتماعی اثرات لوازم اور نتائج۔

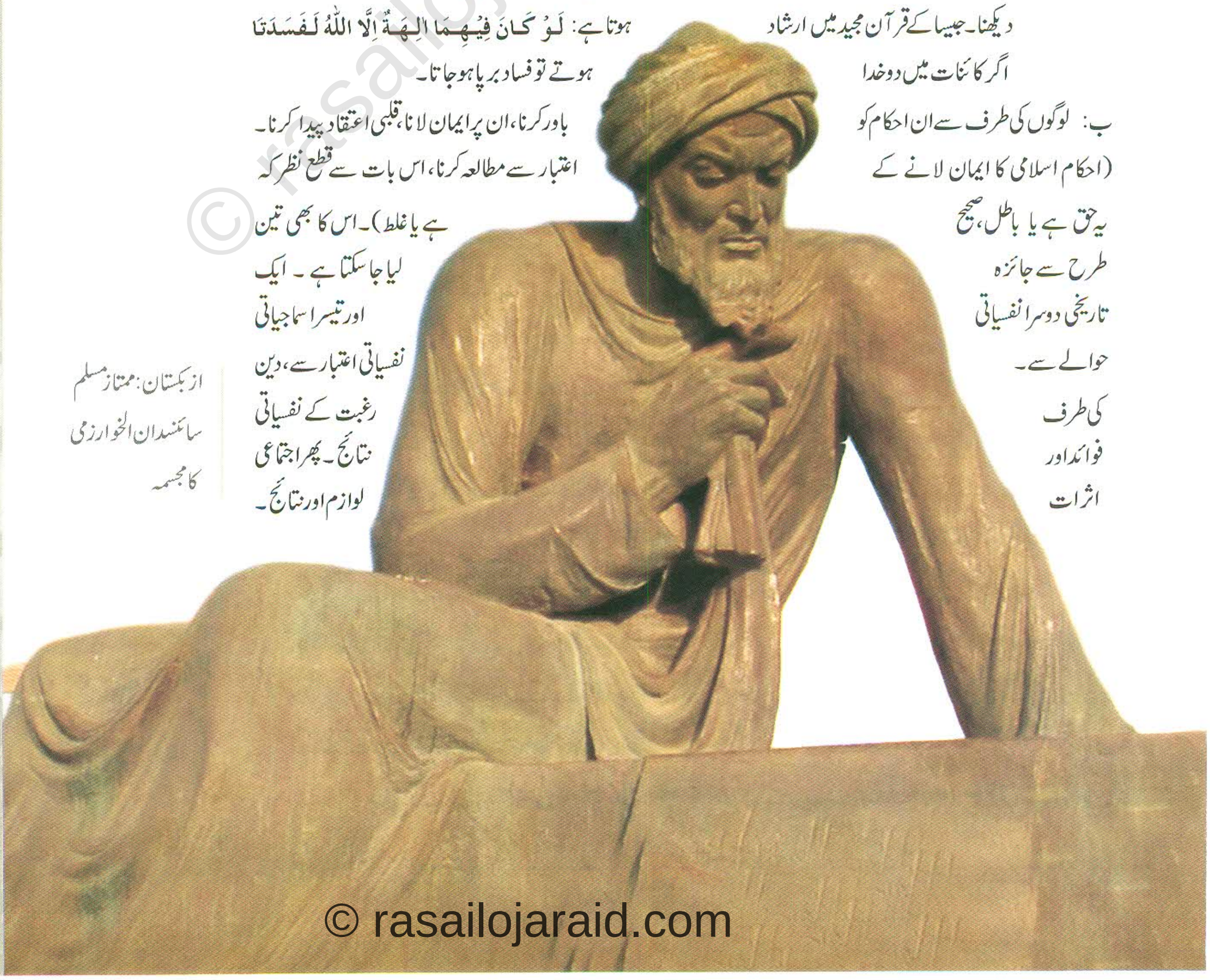

ازبکستان: ممتاز مسلم سائنسدان الخوارزمی کا مجسمہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تاریخی اعتبار سے دینداری کی تاریخ۔ارتقائی سفر،انسان کے دینی تجربات کا اشتراک یا اختلاف وغیرہ۔

اب علم کلام قدیم اور علم کلام جدید کے درمیان بنیادی فرق یہ ہے کہ پہلی قسم میں احکام کی ثقاہت کے اثبات پر زور دیا گیا لیکن دوسری حیثیت یعنی لوازم،نتائج اور فوائد کو نظر انداز کر دیا گیا۔اس حیثیت پر توجہ اس لیے نہیں کی گئی کہ علم نفسیات،سماجیات اور تاریخی علوم نے پہلے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔لیکن اب ان علوم کی ترقی کی وجہ سے دین کی طرف رجحان رکھنے کی نفسیاتی اور سماجی اثرات کے بارے میں مختلف نظریات سامنے آنے شروع ہو گئے ہیں۔ان میں بعض نظریات شبہات کی صورت میں بھی ہیں،جو دین کی طرف رجحان کو خرافات سے تعبیر کرتے ہیں۔اب ان نظریات کو زیر بحث لانے کے لئے جس روش اور جن اصولوں کی ضرورت ہے وہ علم کلام قدیم میں موجود نہیں ہیں۔

پس کلام جدید میں دو قسم کے مسائل ہیں ایک وہ جو بالکل نئے ہیں اور روائتی علم کلام میں ان مسائل کو اٹھایا ہی نہیں گیا۔نفسیات دین،سماجیات دین،دین اور جدیدیت،دین اور جمہوریت،وغیرہ اور ایک وہ مسائل ہیں جو روائتی علم کلام میں موضوع بحث تو بنے ہیں لیکن اب ان کو ایک نئے رخ سے دیکھا جا رہا ہے۔ایک نئے رخ سے ان پر بحث کی جا رہی ہے۔معجزہ،فطرت،ایمان،عقل،وحی۔پہلے وحی کے مسئلے کو ایمان سے جدا کر کے دیکھا جاتا تھا اور اس کا زیادہ تر تعلق نبوت کے اثبات،بعثت نبوت،اہداف بعثت انبیاء،انبیا کے منبع وحی سے ارتباط کی کیفیت سے ہوتا تھا جبکہ ایمان کو معاد کے تناظر میں دیکھا جاتا تھا اور بحث یہ ہوتی تھی کہ کیا گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرنے والا مومن ہے یا کافر؟لیکن اب جدید متکلمین نے اسے وحی اور انسان شناسی کے تناظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔مثلاً خدا سے انسان کے ارتباط کی کیفیت؟ایمان احساسات کا نام ہے یا عقلی چیز ہے؟ایمان کے فقدان سے موجودہ انسان کی زندگی پر کیا اثرات مرتب ہو رہے ہیں وغیرہ؟

پہلی صدی ہجری کے دوسرے نصف حصے کے علمی و فکری تنازعات کے شور شرابے میں دوسری صدی ہجری کے آغاز سے ذرا پہلے معتزلہ کے نام سے اہم ترین کلامی مکتب وجود میں آیا۔

جدید علم کلام .روش،زاویہ نگاہ اور زبان کے لحاظ سے تبدیلی

جدید علم کلام اور روائتی علم کلام میں بنیادی فرق، روش میں تبدیلی سے متعلق ہے۔دور حاضر میں ایک متکلم کو نئے اعتراضات اور شبہات کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جو در اصل نئی معرفتی بنیادوں پر استوار ہونے کی وجہ سے نئی روش کے متقاضی بھی ہیں۔مثال کے طور پر ایک مفسر قرآنی آیات کو سمجھنے کے لیے کبھی روایات کے ذریعے تفسیر کرنے کی روش اختیار کرتا ہے،کبھی ادبی تفسیر کرتا ہے،کبھی عقلی اور کبھی عرفان و تصوف کا سہارا لیتا ہے۔معروف جاپانی محقق ایزتسو توشی ھیکو قرآنی مفاہیم کو بیان کرنے کے لیے علم سیمنٹک (Semantic) کو بنیاد بناتے ہیں کہ جس کے مطابق قرآنی مفاہیم و موضوعات کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھنا چاہیے یعنی قرآن میں تمام فقہی،اخلاقی،اعتقادی مسائل اور داستانوں کو جدا کر کے نہیں دیکھنا چاہیے بلکہ قرآنی متن میں معانی کا ایک خاص نظام موجود ہے۔قرآنی آیات،کلمات اور اصطلاحات کے معانی کے درمیان ایک خاص قسم کا رابطہ ہے جس پر توجہ کرنے سے قرآن کو زیادہ گہرے انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔اس روش میں صاحب متن کے اصل مقصد تک پہنچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔اس اعتبار سے صاحب متن کے قصد و ارادے سے ہٹ کر کوئی بھی جملہ معنی و مفہوم نہیں رکھتا لہٰذا اسے صحیح یا غلط بھی نہیں کہا جا سکتا۔صاحب متن کے مقصد و ارادے کو کبھی تو نحوی و ادبی قواعد اور الفاظ کی دلالت اور شان نزول پر توجہ کرنے سے سمجھا جا سکتا لیکن کبھی پیچیدہ عبارتوں اور اشاروں کنایوں پر مشتمل متون کو سمجھنے کے لیے جملوں کو انفرادی طور پر سمجھنے کی روش مفید ثابت نہیں ہو سکتی بلکہ جملے کی مجموعی حیثیت پر توجہ کرنی پڑتی ہے اور اسے کل کی حیثیت میں دیکھنا پڑتا ہے۔اسی لیے روائتی مفسرین متن کے سیاق اور سورتوں کے درمیان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پائے جانے والے تناسب وہم آہنگی کو اہمیت دیتے ہیں۔ آج کے متکلم کے لیے اب ضروری ہوگیا ہے کہ کبھی وہ متن کی عبارتوں کو ایک نظام کی صورت میں دیکھے اور صاحب متن کے تصور کائنات کو سمجھنے کی کوشش کرے تاکہ اس کی روشنی میں صاحب متن کے اصل منشاء تک پہنچا جاسکے۔ اسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے علم سیمنٹک کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ تاہم اس میں محقق کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے سے بنی ہوئی اپنی ذہنیت کو استعمال کرنے کی بجائے صاحب متن کے دل کی آواز کو سننے کی کوشش کرے۔

اسی طرح اب متن فہمی کے لیے ہرمنوٹیک (Hermeneutics) کی روش اختیار کی جاتی ہے جو علم سیمنٹک کے مد مقابل ہے۔ ہرمنوٹیک میں ضروری نہیں کہ معنی کو صاحب متن کی مراد سے مشروط کیا جائے بلکہ اس میں فہم مخاطب کو اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ سقراط کا خیال تھا کہ خداؤں کے پیغام کو سمجھنے کے لیے صرف کلمات وجملات پر انحصار نہیں کیا جاسکتا بلکہ گفتگو کے ذریعے متن کے باطن تک پہنچا جاسکتا ہے بالکل اس آرٹ وہنر کی طرح جس کو دیکھ کر ہر ایک اپنا معنی اخذ کرتا ہے اور اپنے مطابق پیغام کو حاصل کرتا ہے۔ گویا جتنے دیکھنے والے ہوں گے اتنے ہی پیغام موجود ہوں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک مخاطب جب کسی آرٹ یا ہنر میں جمالیاتی فن کو دیکھتا ہے تو اس کی شخصیت خاص قسم کی معرفت، ذہنیت، ثقافت پر مشتمل اور ہزاروں قسم کی توقعات، ضروریات اور روحانی و مادی احتیاجات کی حامل ہوتی ہے۔ اگرچہ متن، مؤلف کی ذہنی کاوش کا نتیجہ ہوتا ہے لیکن جب وہ کسی متن کی صورت میں قاری کے سامنے آتا ہے تو وہ اپنے ذہنی وعلمی پس منظر اور اپنے تجربات کی روشنی میں اس متن سے معنی اخذ کرتا ہے۔ جتنا زیادہ قاری اپنی بنیادی توقعات کو متن میں محسوس کرے گا اتنا ہی متن کے ساتھ اس کا رابطہ گہرا ہوتا چلا جائے گا۔ گویا متن اس اعتبار سے مخاطب کی ذہنی کیفیات کی تفسیر کرتا ہے، اس کی توقعات ومشکلات اور اس کی ضروریات کو ہی اس کے سامنے مجسم شکل میں پیش کرتا ہے

ایران: ایک علمی مرکز

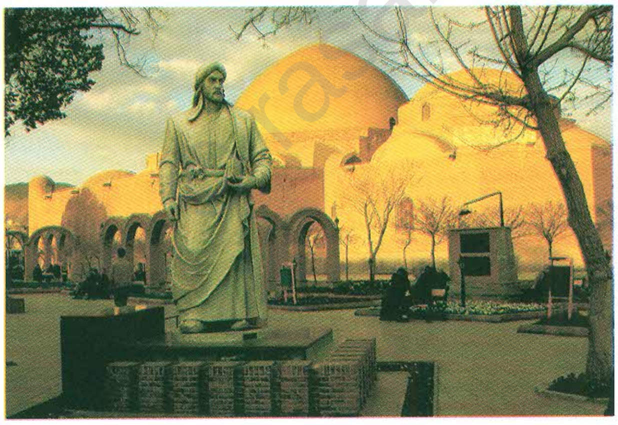

اسی طرح آج کے دور میں ایک متکلم، دین کی تفسیر اور شبہات کے جواب کے لیے اب فلسفہ تحلیلی فلسفہ زبان اور فلسفہ مظہریت کو نظر انداز نہیں کرسکتا اور وہ نئے انسانی علوم کی بنیاد پر ایک نئی روش اختیار کرنے پر مجبور ہے بالکل اسی طرح جیسے گزشتہ دور میں ایک متکلم اپنے مقصد تک پہنچنے کے لیے کبھی برھان کا راستہ اختیار کرتا تھا تو کبھی جدل کا اور کبھی خطابت کا اور جیسا کہ فقہا نے بھی اپنی روش کو بہتر بنا نے کے لیے علم اصول کی بنیاد رکھی۔

زاویہ نگاہ کے لحاظ سے تبدیلی

آج کے متکلم کو ایک نئی روش اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ مسائل کو دیکھنے کے لیے اپنے انداز نظر پر بھی توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔ روش کا تعلق دینی تعلیمات کے اثبات اور مخالف آراء کے ابطال سے ہے جبکہ اس انداز نظر کا تعلق عقائد کی اصلاح اور دینی اعتقادات کو بہتر انداز میں پیش کرنے سے ہے۔ روش کا تعلق عام طور سے کسی موضوع کے بارے میں آخری رائے دینے اور اس کے حق و باطل کے تعین سے ہے، جبکہ زاویہ نظر کا تعلق کشف حقیقت کے مراحل سے ہے۔ گزشتہ دور میں ایک متکلم کا اندازِ نظر براہ راست ہوتا تھا لیکن اب تقابلی تاریخ، دین کو اس کے متن (قرآن وسنت) کے ذریعے سمجھنے کے ساتھ ساتھ ایک معرفت شناس کی حیثیت میں دین کو سماجیاتی، فلسفیانہ، نفسیاتی اور تجربی رخ سے سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اسی طرح تحقیقات میں کثیر الجہتی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

زاویہ نگاہ کی اہمیت بڑھتی جارہی ہے کہ جس میں دین کو صرف ایک رخ سے نہیں دیکھا جا سکتا بلکہ بیک وقت اس کے مختلف پہلوؤں پر توجہ کرنے کی ضرورت ہے۔

زبان کے اعتبار سے تبدیلی

کلمات اور اصطلاحات کے معانی کے درمیان ایک خاص قسم کا رابطہ ہے جس پر توجہ کرنے سے قرآن کو زیادہ گہرے انداز میں سمجھا جا سکتا ہے۔

کلام جدید کا ایک اہم پہلو، متکلم کی زبان سے متعلق ہے۔ متکلم دراصل وحی اور مخاطب کے ذہن وزبان کے درمیان ایک رابطے کا کام کرتا ہے۔ گزشتہ دور کے متکلمین کا انداز بیان اپنے معاشرے کی زبان سے ہم آہنگ تھا جبکہ آج کے متکلم کے لیے ضروری ہے کہ وہ آج کے مخاطبین کے ذہن اور زبان کے مطابق بات کرے۔ علاوہ ازیں کلام جدید میں زبان کے اعتبار سے تبدیلی کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ آج کا متکلم دین کی نئی تعبیرات وتشریحات میں سے صحیح تعبیر کا مضبوط معیار پیش کرے اور اس بات کی وضاحت کرے کہ دور جدید میں فہم دین کے اختلاف کے حوالے سے جونئی بحثوں نے جنم لیا ہے اور جس طرح دین کی مختلف تعبیرات پیش کی جارہی ہیں ان میں سے کون سے تعبیر احیائے دین کے زمرے میں آتی ہے اور کون سے دین میں مزید تحریف کا باعث بن رہی ہے۔

علوم کا ارتقاء اور اس ضمن میں اٹھنے والی یہ بحثیں اس بات کی ضرورت کو نمایاں کررہی ہیں کہ مسلمان اہلِ علم ایک طرف پوری طرح ان علوم سے واقفیت حاصل کریں اور دوسری طرف اس بات کی کوشش کی جائے کہ دین کے مقدمات کو ان جدید اسالیبِ علم کی روشنی میں اس طرح سے بیان کیا جائے کہ جدید نظریۂ علم کے زیر اثر پروان چڑھنے والی نسل ان مقدمات کو قبول کرنے میں کسی تکلف کا مظاہرہ نہ کرے۔

(ڈاکٹر ناصر زیدی اسلامی نظریاتی کونسل میں ڈائریکٹر جنرل ریسرچ ہیں)

© rasailojaraid.com